مطبوعات

تفسیر سورۂ مرسلات تالیف مولانا حمید الدین فراہیؒ - ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی - ضخامت ۵۲ صفحات - قیمت ۵ ر - دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر - ضلع اعظم گڑھ -

سورۂ مرسلات کی یہ تفسیر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم و مغفور کی تفسیر نظام القرآن کے اُن اجزاء میں سے ہے جنکو عربی اور اردو میں شائع کرنے کا مبارک سلسلہ دائرۂ حمیدیہ نے کچھ مدت سے جاری کر رکھا ہے - اس سلسلہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ اسکے جس جزء کو بھی پڑھینگے، وہ آپکو صرف اُسی سورہ کے معنی و مطلب سے آشنا نہ کریگا جسکی تفسیر اُس جزء میں کی گئی ہو، بلکہ اسکے ساتھ ہی پورے قرآن کو سمجھنے کے لیے آپکو بہت سی اصولی معلومات بھی دیگا، تحقیق کے نئے راستے دکھائیگا، تدبر فی القرآن کے نئے نئے دروازے کھولیگا - یہی خوبی زیر نظر تفسیر سورۂ مرسلات میں بھی ہے - مثلاً اس میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کی تکرار پر مولانا نے جو مختصر بحث فرمائی ہے وہ صرف اسی سورہ کے لیے نہیں بلکہ ان تمام سورتوں کے لیے ایک کلید کا کام دے سکتی ہے جن میں کسی خاص جملہ کو بار بار دہرایا گیا ہے یہ محض ایک مثال ہے، ورنہ یہ چھوٹا سا رسالہ لغت، معانی اور تفسیر کے متعدد دوسرے فوائد بھی اپنے اندر رکھتا ہے -

اقسام القرآن تالیف مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ - ترجمہ امین احسن صاحب اصلاحی - ضخامت ۱۰۸ صفحات - قیمت ۸ ر - دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر -

یہ مولانا کے عربی رسالہ "امعان فی اقسام القرآن" کا ترجمہ ہے - اس میں مولانا نے قرآن مجید

کی قسموں پر بہترین محققانہ بحث کر کے کتاب الٰہی کے اُن تمام مقامات کو سمجھنے کے لیے ایک کلید فراہم کر دی ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے قسم کو بیانِ مدعا کا ذریعہ بنایا ہے۔ اگرچہ اس میں اُن سب آیات کی تفسیر نہیں کی گئی ہے جو قسم پر مشتمل ہیں، مگر جو اصولی بحث مولانا نے کی ہے وہ اُن تمام مشکلات کو دور کر دیتی ہے جو اس نوع کی آیات میں عموماً قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کو پیش آتی ہیں۔ فی الواقع قرآن کی خدمت کے سلسلے میں جو چند بڑے کارنامے مصنف مرحوم سے انجام پائے ہیں، یہ رسالہ بھی انہی میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ اُن سے پہلے کسی نے اقسام قرآن کی گتھی کو اس خوبی کے ساتھ نہ سلجھایا تھا۔

ترجمہ و تفسیر پارۂ عم | ادارہ دار الاسلام، پٹھان کوٹ۔ قیمت ۸ ر

قرآن مجید کے تیسویں پارے کا عام فہم ترجمہ و تفسیر معہ تشریح الفاظ۔ جو لوگ قرآن کا تحقیقی مطالعہ کرنیکے بجائے صرف سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہوں اُنکے لیے اس طرز کی تفسیر مفید اور انکی ضرورت کے لیے کافی ہے۔ ترجمہ و تفسیر کو جس حد تک ہم نے دیکھا، قابلِ اطمینان پایا۔

ترتیب نزول قرآن | پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب۔ ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد پانچ روپیہ۔ کتاب گھر ۱۱ سرائے گڑھا۔ الٰہ آباد۔

پروفیسر صاحب نے قرآن کی اندرونی شہادت اور دعوت اسلامی کے تاریخی ارتقاء اور روایات کی مدد سے قرآن مجید کی نزولی ترتیب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے نتائج تحقیق کو اس کتاب کی صورت میں پیش فرمایا ہے۔ ساتھ ساتھ دوسرے محققین کی تجویز کردہ ترتیب، اور متقدمین کی بتائی ہوئی ترتیب کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اس حد تک انکی یہ خدمت قرآن بہت قابلِ قدر ہے اور قرآن مجید کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ لیکن جن مقدمات کے ساتھ انہوں نے اپنی اس تحقیق کو پیش فرمایا ہے، اور جو مستشرقانہ اندازِ بیان اسکے لیے اختیار کیا ہے، افسوس ہے کہ اسکے بیشتر حصہ سے اتفاق کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ان چیزوں کے بغیر بھی یہ تحقیق بہت اچھی طرح پیش کی جا سکتی تھی اور اُس صورت میں بھی یہ اتنی ہی قابلِ قدر ہوتی جتنی اب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کا تحقیقی مطالعہ کرنے، اور اسلام کے مزاج میں گہری بصیرت حاصل کرنے کے لیے قرآن کی ترتیب نزول سے واقف ہونا بہت کچھ مفید ہے، لیکن اس معاملہ میں اتنا مبالغہ کرنا درست نہیں ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب کو غلط یا ناقص کہا جائے، اور نزولی ترتیب کے علم پر قرآن کے فہم کو موقوف سمجھا جائے، اور یہ گمان کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک صحیح ترتیب کے ساتھ ہم تک پہنچانے میں کوتاہی برتی۔ اس قسم کی باتیں عموماً محض نئی نئی تحقیق کے خمار کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ورنہ معمولی غور و فکر سے بھی آدمی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ قرآن صرف ریسرچ اسکالرس ہی کے لیے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ عام لوگوں کی ہدایت بھی اسکے پیش نظر ہے، اور عام ہدایت کے لیے اسکی موجودہ ترتیب نزولی ترتیب کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ بہتر ہے۔ اگر اسے ترتیب نزول کے مطابق مرتب کیا جاتا تو کم از کم ایک ہزار سورے بنتے، اور اس ترتیب کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ناگزیر ہوتا کہ ہر شخص کو قرآن کے ایک ایک نسخے کے ساتھ اس وقت کی تاریخ کا بھی ایک ایک نسخہ دیا جاتا، اور اس تکلف کے باوجود قرآن کی تلاوت میں وہ روانی اور وہ تاثیر نہ ہوتی جو اب ہے، بلکہ بعد کی نسلوں کے لیے وہ محض ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے والوں کا سا ایک خشک تحقیقی مقالہ بنکر رہ جاتا۔ جناب مصنف کا گمان یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام نے بطور خود دے لی ہے، اور صحابہ نے بھی اسے کسی سوچے سمجھے ہوئے نقشہ پر مرتب نہیں کیا، بلکہ جنگ اور بدامنی کی گھبراہٹ میں یونہی جلدی سے جمع کر ڈالا۔ حالانکہ اگر وہ روایات سے قطع نظر کر کے خود قرآن ہی کے مضامین پر غور کریں تو انہیں اندازہ ہو جائے کہ جو کلام اس طرح متفرق طور پر مختلف حالات میں تقریباً ربع صدی تک نازل ہوتا رہا، اسے سمیٹ کر ایک مجموعہ بنا دینا خود متکلم کے سوا کسی دوسرے کے بس کا کام تھا ہی نہیں۔ جو نفس قدوس دعوتِ اسلامی کے آغاز سے لیکر اس کی تکمیل تک ایک خاص نقشے پر اپنی آیات سے اس دعوت کی رہنمائی کرتا رہا، وہی اور صرف وہی یہ جان سکتا تھا کہ ان متفرق آیات کے اندر داخلی ربط کیا ہے اور انہیں ایک مستقل دائمی ہدایت کے لیے جوڑ کر ایک وحدت بنا دینے کی صحیح صورت کیا ہے۔ جناب مصنف نے ان روایات پر بہت زیادہ اعتماد کیا ہے جن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

سے نزولی ترتیب پر قرآن کو مرتب فرمایا تھا۔ حالانکہ میشر صحت، اِن روایات کا مفاد اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے کہ سید نا علی نے محض اہلِ تحقیق کی سہولت کے لیے اس قسم کی ایک یادداشت محفوظ کرنے کی کوشش فرمائی تھی جس سے بعد کے لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو سکے کہ قرآن کی نزولی ترتیب کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرتِ ممدوح اسی ترتیب پر مصحف کی اشاعت بھی چاہتے تھے، اور موجودہ ترتیب سے انہیں اختلاف تھا، تو اسکا قطعاً کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

مصنف نے نزول کی جو ترتیب بیان کی ہے اسے بھی بس مجملاً ہی صحت سے قریب کہا جا سکتا ہے، ورنہ تفصیلات میں بہت کچھ اختلاف کی گنجائش ہے۔ درحقیقت نزول کے اعتبار سے سورتوں کی نمبروار ترتیب مقرر کرنا نہ تو تحقیق کے نقطۂ نظر سے درست ہے اور نہ اسکی ضرورت ہی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اتنا ہی ہے کہ دعوتِ اسلامی کے مختلف ادوار متعین کر کے اسکے مطابق سورتوں کے الگ الگ مجموعے بنا لیے جائیں، اور یوں کہا جائے کہ فلاں مجموعہ فلاں دور کا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ تعین کی جتنی کوشش کی جائیگی اتنی ہی صحت سے دور ہوتی جائیگی۔

قرآن کا فلسفہ مذہب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب استاذِ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن۔ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۸ر۔ مصنف سے مل سکتا ہے۔

یہ ڈاکٹر صاحب کا ایک لکچر ہے جو ۱۹۴۰ء میں جامعۂ عثمانیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلہ میں پڑھا گیا تھا۔ عنوان کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ اس میں کوئی فلسفیانہ بحث ہوگی، اور ایک یونیورسٹی کے استاد فلسفہ سے توقع بھی اسی کی ہو سکتی تھی۔ مگر لکچر کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مذہبی وعظ ہے جو تصوف اور فلسفہ کی ملی جلی زبان میں دیا گیا ہے۔

ہندوستان اور مسئلہ امارت مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ قیمت ۱۲ر۔ دفتر امارت شرعیہ صوبۂ بہار۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ۔

اس کتاب کا مقصد دار الکفر یا دار الحرب میں ایک ایسی امارت شرعیہ کی ضرورت ثابت کرنا ہے جسکے

تحت مسلمان ایک کافر حکومت کے اندر رہتے ہوئے منظم طریقہ پر شرعی زندگی بسر کر سکیں۔ اسکے ثبوت میں فاضل مصنف نے دو طریقوں سے استدلال فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ اسلام پراگندگی و تفرق کی زندگی کو جاہلیت کی زندگی قرار دیتا ہے اور ایک امیر کے تحت جماعت بنکر رہنے کو لازم کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ دارالکفر یا دارالحرب میں بھی اسلامی جماعت و امارت کا قیام نہ صرف درست ہے بلکہ از روئے شرع واجب ہے۔ اس حد تک جو کچھ مصنف نے فرمایا ہے اسکے صحیح ہونے میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اصلی سوال جو اس باب میں فیصلہ طلب تھا اور فاضل مصنف کی اتنی محققانہ بحث کے بعد بھی بدستور فیصلہ طلب ہی رہ گیا ہے وہ یہ ہے کہ دارالکفر یا دارالحرب میں اہلِ ایمان کی جماعتی زندگی اور انکے نصبِ امارت کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟ آیا یہ کہ وہ کافرانہ نظامِ تمدن و سیاست کے اندر ایک منظم مذہبی گروہ کی حیثیت سے اپنی جگہ بنائیں اور جمعہ و جماعت، رویت ہلال، صوم و افطار، زکوٰۃ و خیرات، ائمہ و مؤذنین، مکاتب و مدارس، مساجد و مقابر، نکاح و طلاق، فسخ و تفریق اور وعظ و ارشاد وغیرہ کا انتظام کریں؟ یا یہ کہ وہ خود اپنا ایک فلسفۂ حیات اور نظامِ اخلاق و تہذیب و تمدن و سیاست (با لفاظ دیگر اپنا ایک مستقل دین) رکھنے والی پارٹی کی حیثیت سے اٹھیں اور انقلابی جد و جہد کر کے کافرانہ نظام (دین باطل) کو مٹانے اور اسکی جگہ اسلامی نظام (دین حق) قائم کرنے میں جان و مال کی بازی لگا دیں؟ فاضل مصنف اگرچہ دوسری شق کی طرف بھی کچھ تھوڑا سا میلان رکھتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اسکی عملی صورت کا تصور واضح نہیں ہے۔ بخلاف اسکے انہوں نے اپنا پورا زور پہلی شق کے اثبات پر صرف کیا ہے۔ اسکے ثبوت میں وہ قرآن، حدیث، اور اقوال فقہاء، تینوں سے استدلال فرماتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جہاں تک قرآن اور حدیث کا تعلق ہے، اس سے جتنے شواہد مصنف نے پیش کیے ہیں وہ سب انکے منشار کے خلاف دوسری شق کی شہادت دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی اور قرآن کی مکی سورتوں سے جس قدر استدلال انہوں نے کیا ہے وہ سب دوسری شق کا مؤید ہے نہ کہ پہلی شق کا۔ طالوت کے قصہ سے جو شہادت وہ پیش کرتے ہیں وہ بھی خود منہ سے بول رہی ہے کہ اُس وقت بنی اسرائیل کے اندر امارت کا قیام حکومت کفر کے ماتحت ٹھنڈی ٹھنڈی "شیخ الاسلامی" کے

فرائض انجام دینے کے لیے نہیں ہوا تھا بلکہ انقلابی لڑائی لڑنے کے لیے ہوا تھا۔ غزوہ موتہ میں حضرت خالد کی امارت اور یمامہ میں حضرت معاذ کی امارت بھی پہلی شق کی نہیں بلکہ دوسری ہی شق کی دلیل ہے۔ ان کے سوا اور کوئی دلیل انہوں نے قرآن و حدیث سے پیش نہیں کی، اسلیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس خاص شق کو انہوں نے اختیار کیا ہے اسکے حق میں انکے پاس کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے کوئی اور دلیل ہے یا نہیں۔ البتہ فقہاء کے جو اقوال انہوں نے نقل فرمائے ہیں وہ بلاشبہ انکے مسلک کی پُرزور تائید کرتے ہیں۔ لیکن ان سے صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ مغلوبی کی حالت میں مسلمانوں کو پہلی شق سے بھی غافل نہ ہونا چاہیے اگرچہ انکا اصل فرض دوسری شق ہی کا کام ہے۔

کشف الظلام شیخ تقی الدین سبکی کی کتاب شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام کا اردو ترجمہ از مولانا سید شاہ محمد عز الدین صاحب پھلواروی۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ درج نہیں۔ غالباً مترجم سے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر مل سکے گی۔

یہ کتاب شیخ سبکی نے علامہ ابن تیمیہ کے رد میں لکھی ہے اور زیارتِ قبور، استمداد، توسل، تشفع، اور اسی نوعیت کے مسائل میں ابنِ تیمیہ کے علی الرغم اُس مسلک کو ثابت کیا ہے جو ایک مدت سے عوام میں مقبول چلا آرہا ہے۔ شروع میں مترجم نے ایک دلچسپ مقدمہ لکھا ہے جس میں ابنِ تیمیہ کے علم اور انکی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں بعض خاص مسائل میں گمراہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسکے بعد شیخ سبکی کی مختصر سوانح ہیں جن میں اچھا خاصا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ پھر اصل کتاب کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ صاف اور رواں ہے۔ مگر اسکو کیا کیا جائے کہ خود کتاب ہی کچھ ایسی قابلِ تعریف نہیں ہے۔ شیخ سبکی اور اس قسم کے دوسرے علماء کرام پوری فقیہانہ احتیاط کے ساتھ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے حمیٰ (محارم اللہ) کی عین سرحد تک پہنچا دیتے ہیں اور انہیں اجازت دیتے ہیں کہ تم اس سرحدی نشان کے آس پاس چرتے رہو۔ اب رہی یہ بات کہ وہ اس سرحدی خط کے پاس چرتے چرتے خود حمیٰ کے اندر داخل ہو جائیں، تو اسکی ذمہ داری سے

یہ لوگ اپنے آپکو بری سمجھتے ہیں۔ بلکہ انہیں اپنے گلّے کی بے شمار بھیڑوں کو رات دن حمٰی میں چرتے دیکھ کر بھی اپنی غلطی پر تنبُّہ نہیں ہوتا۔ ابن تیمیہ اور انکے طرز فکر کے لوگوں پر توز یادہ سے زیادہ صرف اتنا ہی الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کچھ تشدُّد کی روش اختیار کی، یعنی حمٰی کے قریب جس حد تک جانے کی شرعاً اجازت مل سکتی تھی اسکو بھی ممنوع ٹھیرا دیا۔ تاہم وہ اپنی ان بندشوں سے جس مقام پر لوگوں کو ٹھیرانا چاہتے تھے وہ بہر حال تقویٰ اور توحید و عبدیت الٰہی کا ہی مقام تھا۔ لیکن انکے خلاف جن لوگوں نے اپنی بھیڑوں کو ٹھیک سرحد حمٰی کے کنارے گرد ہی چرانے رہنے پر اصرار کیا وہ تو ایک بڑے جرم کے مرتکب ہوئے، کیونکہ عامۂ مسلمین کو انہوں نے اُس نازک مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا جہاں خدا پرستی اور مخلوق پرستی کے درمیان بس بال برابر ہی فاصلہ رہ جاتا ہے اور جہاں ایک ذراسی غلط جنبش آدمی کو توحید کے کنارے سے پھسلا کر شرک کے خطرناک کھڈ میں پھینک دیتی ہے۔

تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کے نام	جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی - ضخامت ۴۴ صفحات - قیمت ۱۲؍ انجمن اسلامی تاریخ و تمدن، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ -

یہ مولانا کا ایک مقالہ ہے جو انہوں نے انجمن کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پڑھا تھا۔ اس میں متکلم خود "تمدن اسلام" ہے اور وہ مولانا کی زبان سے بیسویں صدی کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ "میں جب زندہ و توانا تھا" تو ایسا اور ایسا تھا، اور اب بھی اس گئی گذری حالت میں میرے اندر یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ انداز بیان نرالا اور دلچسپ ہے۔ اسلامی تمدن کی بعض اہم خصوصیات کو خوب نمایاں کیا گیا ہے اور انہیں بیسویں صدی کے لوگوں کے لیے جاذب نظر بنانے کی اچھی سعی کی گئی ہے۔ ابتدا میں مولانا محمد طیب صاحب کی تقریظ ہے جس میں فاضل مقالہ نگار کو داد دی گئی ہے کہ "انہوں نے ہمارے لیے اسلامی زندگی کے پیغام کی بر وقت تجدید کی"

اللہ کا شکر ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب کے مقابلہ میں کسی کے اندر ابتغاء فتنہ کی بیماری نہیں ہے ورنہ

اسی مقالہ کو دیکھ کر شور مچایا جا سکتا تھا کہ مولانا دین کو دین کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمدن کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور عنقریب مجدد مأۃ حاضرہ ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہیں۔

ایمان جناب مولانا سید سلیمان ندوی۔ ضخامت ۴۲ صفحات۔ قیمت ۲ر۔ انجمن اسلامی تاریخ و تمدن، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

یہ مقالہ بھی انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر علی گڈھ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں مولانا نے بڑی خوبی کے ساتھ پہلے یہ بتایا ہے کہ جماعتوں، قوموں اور ملتوں کا عروج و ارتقار در اصل کسی عقیدے یا تخیل یہ ایمان کا رہین منت ہوتا ہے۔ اسی ایمان پر اُنکی پوری زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے، اسی کے استحکام پر انکی تعمیر حیات کا استحکام موقوف ہوتا ہے اور اسی کے ضعف سے انکے نظام ہستی کی بندشیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ فرماتے ہیں کہ "کسی قوم و ملت کی اس تعمیری حقیقت سے باخبر رہنا صرف اسلیے ضروری نہیں ہے کہ وہ ہے اور وہ اس سے بنی ہے بلکہ اسلیے بھی ضروری ہے کہ اسکی تجدید و اصلاح کی جب کبھی ضرورت پیش آئے تو اس حقیقت کا واقف کار اسی کے ذریعہ سے اسکی تجدید و مرمت کرے"۔ اسکے بعد مولانا نے یہ بتایا ہے کہ ملت اسلامیہ کی تعمیری حقیقت توحید الٰہی اور رسالت محمدی پر ایمان ہے۔ اس بنیادِ تعمیر سے قطع نظر کر کے اسکی تجدید کی جتنی کوششیں کی جائینگی بیکار ہونگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں میں اسلامی حکومت کے زوال کے بعد سے آج تک بیسیوں تحریکیں مسلمانوں کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کے نام سے اٹھیں اور پھیلیں، مگر جو کامیابی مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک[1] کو حاصل ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی ذہنی و عملی قویٰ کے بیدار کرنے میں جو عظیم الشان کام کیا اسکی صرف یہی وجہ تھی کہ وہ تجدید اسلام کے اصل و اساس، نظام حقیقی کو سامنے رکھ کر شروع کی گئی تھی"۔ آگے چل کر مولانا نے مختلف قوموں اور ملتوں کے اساسی عقائد کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ اسلامی عقائد کے سوا کوئی دوسرا عقیدہ ایسا نہیں ہے جسکی بنیاد پر کسی عالمگیر اور صالح نظام تمدن کی بنیاد قائم ہو سکتی

[1] یہ مولانا کے اپنے الفاظ ہیں۔ کیا مولانا اسماعیل شہید بھی انہی متکلمین میں سے تھے جنہوں نے اسلام ایک تحریک کا نام رکھ کر سارے مسائل سلجھانے کی کوشش کی ہے؟

ہو۔ پھر وہ ایمان اور عمل کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر تحریک اور ہر جماعت کے لیے ناگزیر ہے کہ اپنے اساسی عقیدہ کو ہر دوسری چیز سے بڑھ کر اہمیت دے۔ "اگر اس میں اصول و عقیدہ پر ایمان کا مطالبہ کیے بغیر ہر کس و ناکس کو داخل کی اجازت دیدی جائے تو اس مستحکم دیوار میں یقیناً رخنے پڑ جائینگے" درحقیقت یہ پورا مقالہ اس لائق ہے کہ اسکا نہایت غور سے مطالعہ کیا جائے۔

اس کے آغاز میں بھی مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی تقریظ ہے جس میں یہ تمنا ظاہر کی گئی ہے کہ "خدائے برتر ہماری مسلم یونیورسٹی کے کارآمد اور رکارکن اجزار و اعضار کو اس مقدس پیغام کا علماً حامل، عملاً قابل اور قولاً سچا داعی بنا دے" بہتر ہوتا کہ صاحب تقریظ اس مقدس تمنا کا اظہار کرنے کے ساتھ اپنے مخاطب نوجوانوں کو اس تلخ حقیقت پر بھی متنبہ فرما دیتے کہ اگر کہیں واقعی یہ حرکت کرنے پر تم آمادہ ہو گئے تو سب سے پہلے وہی لوگ تمہیں فتنہ ثابت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے جو یہ بیش قیمت مقالے تمہیں سنایا کرتے ہیں۔ عافیت چاہتے ہو تو ان مقالوں کو سنو اور بس اسلام کی نظری کرامات پر سر دھن کر اپنے انہی کاموں میں لگ جاؤ جو دنیا میں ہو رہے ہیں۔

فردوس گم گشتہ | جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز۔ ضخامت ۴۲ صفحات - قیمت ۲/ - انجمن اسلامی تاریخ و تمدن، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

یہ مقالہ بھی انجمن کی دعوت پر علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں چودھری صاحب نے اسلام کے تین عناصر ترکیبی یعنی ضابطہ قوانین الٰہیہ، اسکو نافذ کرنے والی طاقت، اور ان دونوں کی حامل جماعت مومنین، کے غیر منفک اور لازمی تعلق پر زور دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ پہلا عنصر تو الحمدللہ موجود ہے، مگر باقی دو عنصر تقریباً مفقود ہیں، اور یہی ہماری وہ فردوس گم گشتہ ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہمیں مردانہ وار کوشش کرنی چاہیے۔ ۲۱ صفحوں تک مقالہ پورے زور کے ساتھ اسی مضمون کو لیے ہوئے چلتا ہے یہاں تک کہ آخر میں پہنچ کر بات اس پر ختم ہوتی ہے کہ اپنی اس گم گشتہ فردوس کی طرف ہم پیاسے کی سی بے تابی

سے ساتھ نہیں بلکہ اسی تدریج کے ساتھ بڑھینگے جس تاریخ کے ساتھ اس سے نکلے تھے حتی کہ ابتدائی مراحل میں یہ محسوس تک نہ ہو سکیگا کہ ہم اپنے اس کھوئے ہوئے مطلوب کی طرف بڑھ بھی رہے ہیں یا نہیں۔ رہے قوانین فطرت، تو غالباً ان سے درخواست کی جائیگی کہ ہم چونکہ تمہارے چہیتے ہیں اس لیے ہماری خاطر اپنے اندر ذرا ترمیم کرو۔ ابتدائے آفرنیش سے اب تک تم نے کسی ایسے انسانی گروہ کو اپنے نصب العین کے مطابق دنیا کا نظام بدلنے میں کامیاب نہیں ہونے دیا ہے جو پورے انقلابی جوش کے ساتھ اپنے اصولوں کے اتباع اور اُنکی محبت کے نشے میں سرشار ہو کر نہ اٹھا ہو۔ اب تک تم انحطاط میں تدریجی سردی مگر عروج کے لیے طوفانی حرارت کا مطالبہ کرتے رہے ہو۔ لیکن اب ہمارے ساتھ تم اتنی رعایت کرو کہ ہمیں تاریخ میں پہلی مرتبہ ارتقائی طرز کا انقلاب برپا کر لینے دو۔ خدا کے بے لاگ فطری قوانین سے ایسی درخواستیں کرنے میں مضائقہ تو کچھ نہیں ہے، اور یہ سمجھ کر دل کو تسکین بھی دی جا سکتی ہے کہ شاید یہ درخواستیں قبول ہو جائیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان قوانین میں نہ کبھی کسی کے لیے ترمیم ہوئی ہے، نہ اب ہو سکتی ہے۔

تمدن اسلام کی کہانی اسی کی زبانی | جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ ضخامت ۵۲ صفحات قیمت ۸/ر۔ انجمن اسلامی تاریخ و تمدن، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس مقالہ میں تمدن اسلام کی کہانی خود اسی کی زبانی سنوائی گئی ہے۔ آدم علیہ السلام سے لیکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک مختلف انبیاء کے دور میں جس جس طرح اسلام اور جاہلیت کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں جس طرح اسلام اپنے آپکو نمایاں کرتا رہا، پہلے اسے قصہ و داستان کے پیرایہ میں مختصراً بیان کیا گیا ہے، پھر اسی پیرایۂ بیان کو قائم رکھتے ہوئے تمدن اسلام کے مختلف اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، معاشی پہلوؤں کو جاہلیت کے مظاہر سے ممیز کر کے دکھایا گیا ہے۔ کسی موضوع پر مفصل تحقیقی بحث تو ظاہر ہے کہ اس طرز بیان میں نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن ایک طالب حق کے لیے ضلالتوں کے مقابلہ میں ہدایت کے آثار و علائم کی نشان دہی فاضل مقالہ نگار نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ ایک

دو مقام نگاہ سے ایسے بھی گذرے جہاں مصنف کا قلم راست روی سے ہٹ گیا ہے - مثلاً ایک جگہ خلیفۂ اسلام کے لیئے "ڈکٹیٹر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو بالکل ہی نامناسب ہے - اور ایک دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی قلمرو میں "پوری پوری شہنشاہیاں" داخل تھیں، حالانکہ اسلام کی قلمرو میں انسان کی شہنشاہی تو درکنار "شاہی" تک کے بیے گنجائش نہیں ہے - یہ اگرچہ محض تعبیری لغزشیں ہیں، لیکن ناواقف لوگوں کو بڑی غلط فہمیوں میں ڈال سکتی ہیں، اسلیے بہتر ہو کہ آئندہ ایڈیشن میں ان کی اصلاح کردی جائے -

باقیات بجنوری | عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم - ضخامت تقریباً ڈھائی سو صفحات - مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے - مکتبۂ جامعہ، دھلی -

یہ عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مضامین، خطوط اور نظموں کا مجموعہ ہے - اسے ایک قسم کا کشکول سمجھنا چاہیے جس میں ہر قسم کی باتیں موجود ہیں - جگہ جگہ سنگریزوں کے درمیان جواہر بھی بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں - بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہندوستانی مسلمانوں کا اونچا تعلیم یافتہ طبقہ جس ذہنی حالت میں مبتلا تھا، یہ مجموعہ اسکا خاصا دلچسپ نمونہ ہے - سوچنے کی عادت ہو چکی تھی، نظر میں کچھ گہرائی بھی آگئی تھی، معلومات میں وسعت بھی پیدا ہو رہی تھی، جذبات میں بھی لہریں اٹھ رہی تھیں، مگر کوئی ایک نظام فکر نہ تھا جس میں تمام افکار و جذبات منظم ہو کر ایک ہموار مزاج پکڑ لیں - یہ دور ابھی ختم نہیں ہوا ہے، اسکے باقیات کثرت سے اب بھی موجود ہیں - مگر جس زمانے کی یہ تحریریں ہیں وہ اس پراگندہ ذھنیت اور ڈانواڈول جذبات کے شباب کا زمانہ تھا - لہذا جو مفید نکات بجنوری مرحوم کے قلم سے نکل گئے ہیں ان سے قطع نظر کرتے ہوئے، تاریخی ذوق کے لحاظ سے بھی اس مجموعہ کا مطالعہ خالی از فائدہ نہیں -

(بقیہ مطبوعات بر صفحہ ۳۱۴)

بقیہ مطبوعات بسلسلہ صفحہ ۳۱۲

ادارہ تعلیم و ترقی کی مطبوعات جامعہ ملیہ دہلی نے " ادارہ تعلیم و ترقی " کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد عوام کی جہالت کو دور کرنا، اور خصوصیت کے ساتھ بالغوں میں تعلیم پھیلانا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے بہت سے کتبے، اور چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کیے ہیں جن میں دلچسپ قصے کہانیاں، نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، جغرافی، تاریخی اور مذہبی معلومات بھی ہیں، ملکی انتظام اور سیاسی معلومات کے متعلق بھی ابتدائی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے، اور یہ سب کچھ ایسے طریقہ پر کیا گیا ہے جس سے تعلیمی مہارت اور نفسیاتِ عوام پر گہری نظر آشکارا ہوتی ہے۔ تمام کتبوں اور رسالوں کی زبان نہایت سہل اور لطیف ہے اور ہر چیز کو جاذب نظر اور جاذب توجہ بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

عوام کی تعلیم سے تمام مختلف الخیال جماعتوں کا مفاد یکساں طور پر وابستہ ہے۔ جو خیالات کوئی جماعت پھیلانا چاہتی ہے ان کے پھیلنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کی جہالت ہے۔ اس لیے جہاں تک ان لوگوں کو خواندہ بنانے کا تعلق ہے، اسکے لیے جو سعی بھی کہیں سے کی جائے اس میں تمام مختلف الخیال جماعتوں کو شریک ہو کر ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیے۔ البتہ جب اس کوشش میں دانستہ یا نادانستہ کوئی عنصر کسی جماعت کے مخصوص نظریات کا شامل ہو جائے تو اس عنصر کی حد تک تعاون سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ جامعہ کے ادارہ تعلیم و ترقی نے جو رسالے شائع کیے ہیں وہ سب ہمارے نقطۂ نظر سے مفید

ہیں، اگر "قومی گیت" کے نام سے جو مجموعہ ہے اُسکی اور اُس جنس کی دوسری تمام چیزوں کی اشاعت میں ہم کوئی حصہ نہیں لے سکتے - لہٰذا جو لوگ ہمارے ہم خیال ہیں وہ اس قسم کی چیزوں کو چھوڑ کر باقی تمام لٹریچر اس ادارہ سے منگائیں اور نہ صرف اس سے کام لیں بلکہ اسکی رہنمائی سے استفادہ کرکے تعلیم عوام کا فن سیکھیں اب تک ۲۶ پمفلٹ ہماری نظر سے گذر چکے ہیں - ہر ایک کی قیمت ۱ر ہے - کتابت غالباً بلا قیمت بھیجے جاتے ہیں -

مضامین محمد علی حصہ دوم | مرتبہ پروفیسر محمد سرور صاحب - ضخامت ۴۰۳ صفحات - مجلد - قیمت عہ مکتبۂ جامعہ، دہلی -

مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین کی ترتیب و اشاعت کا جو سلسلہ پروفیسر محمد سرور صاحب نے شروع کیا ہے اسکے حصہ اول پر ان صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے - اب اسکا دوسرا حصہ ہمارے پیش نظر ہے اس مجموعہ کا بیشتر حصہ مرحوم کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ہندو مسلم مناقشات سے متعلق ہیں - ان مضامین کی ابتدا اُس وقت سے ہوتی ہے جب مولانا محمد علی وطنی اتحاد کے سخت حامی اور کانگریس کے پکے وفادار تھے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں میں اُنکی روش انتہائی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ تھی یہاں تک کہ بعض مواقع پر وہ مسلمانوں کو ملعون کرکے اپنی قوم میں اچھے خاصے بدنام بھی ہو چکے تھے - لیکن ۲۵ء سے ۲۹ء تک جو واقعات پیش آئے وہ بتدریج انکو کانگریس اور اسکی بڑی بڑی شخصیتوں سے بدگمان کرتے چلے گئے یہاں تک کہ بالآخر وہ علانیہ کانگریس سے الگ ہو گئے - کتاب کے ابتدائی تین سو صفحات میں مرحوم کے جو مضامین مرتب کیے گئے ہیں انکے اندر اُس دور کی گویا پوری تاریخ آ گئی ہے، اور یہ محمد علی کے قلم کا کمال ہے کہ ان مضامین کو پڑھتے وقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ سب حالات اب پھر ہمارے سامنے گذر رہے ہیں کتاب کے بقیہ صفحات میں حجاز، افغانستان کی خانہ جنگی، چین، اور ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق مولانا کے مضامین ہیں - اقبال کے متعلق چاروں پانچوں مضمون اس حیثیت سے لاجواب ہیں کہ ان میں گہری محبت اور تلخ

ترین شکایت کے درمیان ایسا توازن نظر آتا ہے کہ کم ہی کسی اور جگہ دیکھنے میں آسکتا ہے۔

ہمیں فاضل مرتب کی اس روش سے اختلاف ہے کہ وہ اکثر اُن مقامات کو جہاں مرحوم نے اپنے معاصرین پر آزادانہ تنقید کی ہے یا تو حذف کر جاتے ہیں، یا نام چھپا دیتے ہیں۔ ایڈٹ کرنیوالے کی یہ روش تاریخ پر ظلم ہے۔ دو ڈھائی سو برس بعد ہندوستان کے موجودہ دور کی تاریخ کے لیے اگر کوئی مورخ اس دستاویز سے کام لینا چاہیگا تو ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ اسکا کتنا قیمتی وقت اُنہی چیزوں کی تلاش میں ضائع ہوگا جنکو آج بالکل فضول سمجھ کر اس آسانی سے ساقط کر دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک صرف یہی نہیں کہ اشخاص کے متعلق مرحوم کے خیالات کو جوں کا توں باقی رہنے دینا چاہیے تھا، بلکہ جہاں مرحوم نے خود نام حذف کر دیے ہیں، یا کسی واقعہ کو اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے وہاں مرتب کو مفصل نوٹ دیکر آئندہ کے طالب علم کے لیے ان مقامات کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر دینی چاہیے تھی۔ ایسے معاملات میں علمی خدمت کرنے والوں کو اپنے معاصرین کی بے جا مروت، یا چھوٹی چھوٹی وقتی مصلحتوں سے اتنا متاثر نہ ہونا چاہیے کہ مستقبل کے عظیم تر علمی فوائد کے ادراک سے انکی نگاہ قاصر رہ جائے۔

رگبی کی زندگی | ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت عـ۸ر۔ مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

یہ ایک دلچسپ انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں رگبی کے پبلک سکول کا ایک سابق طالب علم اپنے مدرسے کے حالات ایک افسانے کی صورت میں پیش کرتا ہے، اور اُن اصولوں کی تشریح کرتا ہے جن پر اس مدرسہ کی تعلیم و تربیت مبنی ہے۔ ہمکو اگر اپنے نظام تعلیم کی تعمیر جدید کبھی کرنی ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ دنیا کے جدید تعلیمی نظریات اور عملی تجربات سے بھی ضرور واقفیت بہم پہنچائیں۔ گو ان میں سے کسی کی بھی ساری چیزیں جوں کی توں لینے کے قابل نہیں ہیں، مگر کسی کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ اس لحاظ سے امور تعلیمی کے متعلق مکتبۂ جامعہ جو معلومات اردو میں شائع کر رہا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہیں۔

جوہر عبدالحق نمبر | انجمن اتحاد جامعۂ ملیہ، دہلی۔ قیمت عـ۸ر۔ رسالۂ جوہر کا یہ خاص نمبر جامعہ ملیہ کے طلبہ نے مشہور خادم اردو ملک، فنا فی الاردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی ستّرویں سالگرہ کے موقع پر شائع کیا ہے۔ جناب موصوف کے حالات، خدمات اور علمی کاموں کے متعلق معلومات کا اچھا ذخیرہ جمع ہے مگر بہتر ہو کہ ہمارے لٹریچر سے اب قصیدہ نگاری کا عنصر خارج ہی کر دیا جائے۔ آج جو مبالغے ہم کرتے ہیں، آئندہ نسلوں کے لیے وہ تاریخی غلط فہمیوں کے موجب ہونگے۔